سنائے گئے۔ راقم الحروف بھی اس جلسہ میں شریک تھا اور اسے یہ کہنے میں بڑی مسرت ہے کہ جوابات عموماً بڑے مدلل مفصل، واضح اور صاف تھے، جو فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں کو کھنگال کر مرتب کیے گئے تھے۔ ان جوابات میں قیمتی مواد کے علاوہ منطقی اور فقیہانہ استدلال بھی تھا اور وقت کے تقاضوں سے باخبر ہونیکا ہوشمندانہ ثبوت بھی! جوابات اکثر و بیشتر بلکہ غالباً سب ہی نوجوان علما کے لکھے اور مرتب کئے ہوئے تھے۔ یہ اور بھی مسرت انگیز بات ہے، بہرحال اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کی سعی کا کوئی اور نتیجہ نہ بھی نکلا، تو بھی یہ کچھ کم اہم بات نہیں ہے کہ اس تقریب سے اس مسلم پرسنل لا کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر فقہی تصریحات و بیانات کا ایسا عمدہ ذخیرہ مہیا کر دیا ہے جو اگر شائع ہو گیا تو یہ بجائے خود دارالعلوم کا ایک عظیم کارنامہ اور علما کی طرف سے اتمام حجت کا باعث ہوگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر خلافتِ راشدہ کی کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو درحقیقت کوئی بھی سماجی اور معاشی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل آسانی کے ساتھ ممکن نہ ہو۔ لیکن موجودہ حالات میں جب کہ غیر مسلم حکومتوں کا کیا ذکر، خود مسلم حکومتوں میں کوئی ایک حکومت بھی صحیح معنی میں اسلامی حکومت نہیں ہے، علما کو سب سے زیادہ توجہ اس بات پر کرنی چاہیے کہ معاشرہ میں فساد اور حالات میں تبدیلی کے باعث احکام میں جو تغیر و تبدل ضروری ہوتا ہے اس کی تنفیذ کی کیا صورت ہوسکتی ہے! کیا یہ اختیار حکومت کو دیا جاسکتا ہے اور اس سے کہہ کر کوئی قانون ایسا بنوایا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ مسلمان اپنی سماجی زندگی میں عام طور پر مروج غیر اسلامی اور خلاف شرع رسوم و عوائد سے محفوظ رہ سکیں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو اختیار دینے کا یہ جواز مطلق ہے یا مقید، یعنی بعض امور کی نسبت یہ اختیار دیا جاسکتا ہے اور بعض کے متعلق نہیں، اگر مقید ہے تو ان امور و معاملات کی تنقیح ہونی چاہیے اور وجہ بتانی چاہیے کہ کیوں بعض امور کا اختیار دیا جاسکتا ہے اور کیوں بعض اور امور کا نہیں دیا جاسکتا، درانحالیکہ فساد کا سبب ہونے میں سب یکساں ہیں، اور اگر حکومت کو کوئی اختیار دیا ہی نہیں جاسکتا تو پھر مسلمانوں کو معاملات میں خلاف شرع طور طریقوں سے محفوظ رکھنے کی کیا صورت [illegible]

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

(۴)

اسلامیانِ ہند کا ایک تہذیبی ورثہ

سرسید اور اسلامی تعلیم و تہذیب :۔ سرسید نے بار بار، پُر زور الفاظ میں کہا اور لکھا بھی کہ ان کے کالج سے ایسے نوجوان پیدا ہوں گے جن کے داہنے ہاتھ میں (ایک اور جگہ) یا ان کے سر پر قرآن مجید ہوگا ..... تو اب دیکھنا چاہیے کہ سرسید نے اس اہم مقصد کے لئے کیا کیا اور اس کے لئے کیا انتظامات کئے؟ اس ایک سوال کے دو جزء ہیں: (الف) دینیات کی تعلیم اور (ب) اسلامی تہذیب و کردار، اب ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ گفتگو کریں گے تاکہ اصل موضوع پہ گفتگو زیادہ واضح ہو سکے۔

دینیات کی تعلیم :۔ سرسید نے داہنے ہاتھ میں یا سر پر قرآن مجید کی جو بات کہی تھی پوری سچائی، عزم راسخ اور جذبۂ کامل سے کہی تھی۔ اس میں اشک شوئی یا محض تصنع کا (جیساکہ سرسید کے ناقد کہتے ہیں) ہرگز کوئی دخل نہیں تھا۔ ان کو دل سے اس بات کا یقین تھا کہ مسلمانوں کو بہر حال عمل اور کردار کے اعتبار سے پکا اور سچا مسلمان بننا ہے کیونکہ دنیا میں اس قوم کا کوئی وجود نہیں ہوتا جس کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہوتی اور مسلمانوں کی تہذیب کا تار و پود جو کچھ ہے وہ ان کے مذہب کے ہی بنا اور تیار ہوا ہے۔ اس بنا پر اگر مسلمان مذہب سے الگ ہو گئے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کا قومی اور ملی وجود ہی ختم ہوگیا ہاں بے شبہ سرسید مسلمانوں کو ایک ماڈرن اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ایک جدید ترقی یافتہ اور عروج پذیر قوم بنانا چاہتے تھے، لیکن ان کو یقین تھا کہ اسلام اس راہ میں حائل

نہیں ہے اور اس کی اصلی اور سچی تعلیمات نہ صرف اجازت دیتی ہیں، بلکہ حکم دیتی ہیں کہ ہر زمانہ میں دنیا کی جو اعلیٰ تہذیب ہو اس کی اچھی اور مفید باتوں کو اختیار کر کے اسلام کے اصول اور اس کی بنیادی تہذیبی و تمدنی تعلیمات کو ان کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ بنایا جائے کہ ان دونوں کے امتزاج سے تہذیب کا جو خاکہ تیار ہو وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی منفرد تہذیب ہو۔ صحرائے عرب سے نکلنے کے بعد جب مسلمانوں نے دنیا میں پھیلنا شروع کیا اور اس راہ میں ان کو اس عہد کی نئی نئی قوموں اور ان کی تہذیبوں سے واسطہ پڑا تو ان کا عمل ہمیشہ خذ ما صفا ودع ما کدر پر رہا ہے، اسی کو ہم دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے فاتح ہونے کے باوجود مفتوح اقوام کی تہذیب و تمدن کا قلع قمع نہیں کیا، بلکہ ان کی تہذیب کے صالح عناصر و اجزا کو اختیار کر کے ان کی اسلامی اصولِ معاشرت و اخلاق کے ساتھ ایسی پیوند کاری کی کہ قالب تو بدل گیا مگر روح سرتاسر اسلامی رہی۔ اسلام کی تعلیمات کے ماتحت زندگی سے متعلق مسلمانوں کا یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو تاریخ کے ہر دور میں اور تہذیبِ انسانی کے عروج و ارتقا کے ہر مرحلہ میں مسلمانوں کے قومی وجود کے استحکام اور اس کے نشو و نما کا ضامن رہا ہے۔ سرسید کے علم و یقین میں مسلمانوں کو پہلے واسطہ اپنی مفتوح اقوام کی تہذیب اور ان کے تمدن سے پڑتا تھا۔ لیکن آج خدا کی مرضی! ان کا واسطہ اس قوم کی تہذیب سے ہے جو مسلمانوں کی محکوم نہیں۔ بلکہ حاکم ہے، اور جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے مشرق و مغرب میں اپنے علوم و فنون اور اپنی تہذیب کی طاقت و قوت کے سہارے پھیلتی اور غالب ہوتی جا رہی ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کی جو روش ماضی میں دوسری تہذیبوں کے ساتھ رہی ہے وہی اب مغربی تہذیب کے ساتھ بھی ہونی چاہیے، ورنہ تہذیبِ جدید کے اس بحران و تلاطم کے زمانہ میں مسلمانوں کا رویہ اگر منفی رہا اور عہدِ جدید کے تقاضوں پر انھوں نے دھیان نہ دیا تو یہ عہدِ گذشتہ کی ایک حسرت ....

انگریز یادگار ہو کر رہ جائیں گے۔ یہی وہ فکر و خیال تھا جس کے باعث سرسید جہاں مسلمانوں کے لئے اعلیٰ ماڈرن تعلیم اور مغربی تہذیب کے صالح اور مفید عناصر کو اختیار کرنا ضروری سمجھتے تھے مذہبی تعلیم اور اسلامی تہذیب اخلاق کے مطابق زندگی بسر کرنے کو بھی ان کے لئے ضروری اور لازمی قرار دیتے تھے۔ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کی اس پیوندکاری پر سرسید کے مخالفوں نے انھیں اور علی گڈھ کالج کو کیا کچھ نہیں کہا۔ لیکن مجھے آج تک کسی ایسے مسلمان کا نام معلوم نہیں ہوا جو علی گڈھ میں تعلیم پانے کے باعث عیسائی بن گیا ہو۔ حالانکہ عیسائی مشنریز نے اپنا ایک بڑا ادارہ وہاں بھی قائم کر رکھا تھا۔

بہرحال اس اہم اور عظیم مقصد کے پیش نظر سرسید نے جو نصاب تعلیم بنایا اس میں دینیات کی تعلیم کو ہر ایک مسلمان طالب علم کے لئے ضروری اور لازمی قرار دیا۔ اس معاملہ میں سرسید کی نیک نیتی اور ان کے خلوص کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ چونکہ اپنے مذہبی خیالات و افکار (جن میں سے بعض ہمارے نزدیک صحیح ہیں اور بعض غلط) کے باعث وہ مسلمانوں میں عام طور پر بدنام تھے اس بنا پر دینیات کی تعلیم اور اس کے نصاب وغیرہ پر غور کرنے کی غرض سے انھوں نے شیعہ و سنی دینیات کیلئے الگ الگ جو دو کمیٹیاں بنائی تھیں اپنے آپ کو ان دونوں سے الگ رکھا اور کسی ایک کمیٹی کے معمولی ممبر بھی نہیں بنے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنی مذہبی کتابوں اور رسالوں میں سے کسی ایک کتاب یا رسالے کو کلاً یا جزءاً نہ شریک نصاب بنانے کی خواہش کی اور نہ طلبا کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی۔ دینیات کے معاملہ میں سرسید کے اس خلوص اور ان کے جذبۂ صادق کے باوجود نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دینیات کی تعلیم سرسید کے زمانہ میں اور ان کے بعد کالج کے یونیورسٹی بن جانے کے عہد میں بھی کبھی کالج یا یونیورسٹی کے شایان شان اور خاطر خواہ نہیں ہو سکی۔ اور اس سے وہ توقعات بالکل پوری نہ ہوئیں جو سرسید کے نہاں خانۂ قلب و دماغ میں موجزن تھیں۔ اس کا سبب

کیا تھا؟ مولانا حالی فرماتے ہیں :

"مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کے خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں یہ شایانِ جیسی کہ ایک محمڈن کالج میں ہونی چاہیئے ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہونچی لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے منتظموں پر عائد نہیں ہوتا اول تو دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لئے جدا جدا مقرر ہوئی ہیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی، انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی، دوسرے دنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ ان کے پورا کرنے میں طلبا کو دوسری طرف متوجہ ہونیکا بہت ہی کم موقع ملتا ہے" (حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۸۲)۔

لیکن ہمارے نزدیک اس کے بنیادی سبب دو ہیں :۔

(۱) ایک یہ کہ سرسید نے، جیسا کہ اصولاً ہونا چاہیئے تھا۔ دینیات کی تعلیم اور اس کے بندوبست کا سارا کام علما کے سپرد کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں مولانا محمد قاسم النانوتوی سے بڑھ کر مستند اور بلند پایہ عالم اور کون ہوسکتا تھا اور مولانا اور سرسید میں جو مخالفت تھی وہ بھی سب کو معلوم ہے، لیکن اس کے باوجود سرسید نے دینیات کی تعلیم اور اس کی نگرانی کا سارا کام مولانا کے سپرد کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے مولانا سے درخواست کی اور مولانا کی شرط کے مطابق سرسید اس کمیٹی سے الگ بھی رہے، لیکن اس کے باوجود سرسید مولانا کا تعاون حاصل نہ کرسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے منشا کے مطابق یہ کام علما کے کرنیکا تھا لیکن اس موقع پر انہوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی فرض شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔ عالمِ اسلام کی بدقسمتی! علما جو ہوا میں گرہ باندھ سکتے اور دور کی کوڑی لانے میں مشق و مہارت رکھتے ہیں وقت پر ہوا کا رُخ پہچاننے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔

(۲) دوسرا سبب یہ تھا کہ جو علماء کالج یا یونیورسٹی میں دینیات کا درس دیتے رہے تھے وہ پختہ استعداد ضرور رکھتے تھے لیکن یہ روشن خیال علماء نہیں تھے۔ ان کے نزدیک دینیات اور خود اسلام کا تصور محدود تھا۔ انھوں نے اسلام کا مطالعہ شاہ ولی اللہ دہلوی یا جمال الدین افغانی کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام کا حاصل بجز اس کے کچھ اور نہ تھا کہ "خاتمہ بالخیر" ہو اور آخرت میں جنت نصیب ہو جائے۔ اسلام کس طرح ایک عالمگیر اور اجتماعی مذہب ہے؟ وہ کس طرح ہر لمحہ نمو پذیر معاشرۂ انسانی کی جملہ ضرورتوں کی علی وجہ الکمال والتمام تکمیل کا ضامن ہے؟ مغربی تہذیب اور مغربی علوم و فنون نے کس طرح ایک جدید علم کلام کی ضرورت پیدا کی ہے اور وہ ضرورت کیونکر پوری کی جاسکتی ہے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات سے ان حضرات کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اس بنا پر یہاں دینیات کے لئے جو نصاب تیار کیا گیا وہ وضو اور نجاست اور نماز روزہ وغیرہ کے مسائل تک محدود رہا اور اس لئے یونیورسٹی کے ایک وقیع مضمون کی حیثیت سے اس کو کوئی وقعت حاصل نہ ہو سکی۔

یہ حال تو تھا دینیات کے نصابِ تعلیم کا! اب ذرا اس کے اہتمام اور اس کی نگرانی کا ماجرا بھی سن لیجئے۔ علی گڈھ کے ایک قدیم پوسٹ گریجویٹ حمید الدین خاں صاحب اپنے عہد کے شعبۂ دینیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "مولانا عبداللہ انصاری بڑے نیک خصلت بزرگ تھے اور طلباء سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے بعض لوگ دینیات کی کلاسوں میں کم ہی حاضر ہوتے تھے اور عموماً کوئی نہ کوئی دوست غیر حاضروں کی طرف سے "حاضر جناب" کسی گوشہ سے پکار دیتا تھا۔ دینیات کے امتحان میں بعض کمزور طلباء کاپی میں خوش خط جلی قلم سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" "ماخوذ از لکچر ہائے عالیجناب مولانا ابو محمد عبداللہ انصاری" وغیرہ جیسے الفاظ لکھ کر نہایت عاجزانہ انداز

میں یہ بھی تحریر کر دیتے تھے "یا اللہ تیرے اس عاجز بندے نے دینیات کے سوالوں کے جوابات میں جو غلطیاں کی ہوں ان کو اپنی رحمت سے بخش دے۔ مولانا مرحوم ایسی تحریریں پڑھ کر معاف بھی کر دیتے تھے اور فرماتے: سبحان اللہ کیا دیندار لڑکا ہے۔ (مجلۃ علوم الدین جلد ۱ نمبر ۱ ص ۱۴)۔

پس جب دینیات سے متعلق خود وہاں کے ذمہ دار علماء اور اساتذہ کی سہل انگاری اور بے اعتنائی کا یہ عالم ہو تو اربابِ انتظام اور دوسرے حضرات سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اس شعبہ کا بھی خاطر خواہ انتظام اور بندوبست کرتے، چنانچہ آج بھی جب کہ سائنس، انجینئرنگ اور کامرس کا ذکر نہیں! آرٹس اور سوشل سائنس کے بعض بعض شعبوں میں دو دو اور تین تین پروفیسر ہیں اور یونیورسٹی کا بجٹ ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے دینیات کی فیکلٹی اسنی اور شیعہ دینیات میں ایک ریڈر اور چند لکچرروں کے سہارے چل رہی ہے۔

اسلامی تہذیب :- بہر حال سر سید نے داہنے ہاتھ میں قرآن کی جو بات کہی تھی علما کی کوتاہی اور بے بصیرتی کے باعث اس میں تو کامیابی حاصل نہ ہو سکی لیکن اس کا دوسرا جزء تھا اسلامی تہذیب! یہ خود سر سید کے اپنے بس کی بات تھی، چنانچہ انہوں نے اس کو بڑی قوت اور عزم کے ساتھ قائم کیا اور جس طرح کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیاں عیسائی تہذیب و تمدن کی، اور پھر امریکہ اور کناڈا اور یورپ میں بعض یونیورسٹیاں کیتھولک چرچ اور بعض یونیورسٹیاں پروٹسٹنٹ چرچ کی نمائندہ ہیں بنارس ہندو یونیورسٹی ہندو کلچر کی اور شانتی نکیتن ڈاکٹر ٹیگور کے تہذیبی تصور کی ترجمان ہیں۔ اسی طرح علی گڈھ کالج (جو بعد میں یونیورسٹی بنا) اسلامی کلچر اور اسلامی ثقافت و تہذیب کا ایک مرکز بن گیا۔

کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہونیکا مطلب :- لیکن اس موقع پر یہ حقیقت ذہن

نشین کرلینی چاہیئے کہ کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہونیکا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس ادارہ کے تمام افراد عبادات اور جملہ رسوم و معاملات میں یکساں ہوتے ہیں، عبادات کا معاملہ بندہ اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اس لئے وہ انفرادی اعمال و افعال ہیں اور تہذیب کا تعلق اجتماعیت کے ساتھ ہے، اس بنا پر کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں سب افراد اپنی تہذیب کے اقدارِ عالیہ سے وابستہ ہیں اور وہ اس کا احترام و ادب ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے اخلاق، عادات، ان کا اپنوں اور غیروں کے ساتھ برتاؤ اور ان کی معاشرتی زندگی، ان کے فکر کا اسلوب ان کی رفتار اور گفتار یہ سب ان کی تہذیبی اقدار کا ترجمان ہوتے ہیں، عبادات کے معاملہ میں وہ باہم کیسے ہی مختلف ہوں، لیکن اجتماعی زندگی میں مذہبی شعائر و رسوم جو ایک قوم کے ملی خصائص اور اس کے لئے وجہِ امتیاز ہوتے ہیں ان کی رعایت اور نگہداشت بہر حال ضروری اور واجب ہوتی ہے، اسی کو علامہ اقبال نے سورج کی کرن کہا ہے۔ فرماتے ہیں:

چمک سورج میں کیا باقی رہیگی
اگر بیزار ہے اپنی کرن سے !!

یہ تہذیب ایک قوم کی انفرادیت اور انسانی معاشرہ میں اس کے امتیاز کی دلیل ہوتی ہے۔ ان وجوہ کے باعث سرسید نے کالج میں تعلیم پانے کے ساتھ وہاں کی اقامتی زندگی کو بھی لازمی قرار دیا کیونکہ اس کے بغیر تربیت کا سروسامان نہیں ہو سکتا تھا سرسید کو اس تربیت کا اس درجہ سے اہتمام تھا کہ انھوں نے بچوں کے لئے بھی کالج میں جگہ پیدا کی کیونکہ بچپن میں جو تربیت ہوتی ہے اس کا رنگ بڑا پختہ ہوتا ہے۔ ان بچوں کے نظام تربیت کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں: ۔

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک بچے مختلف فرائض میں جکڑے رہتے ہیں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا یا گیند بلا کھیلنا، مارننگ

اسکول، نائٹ اسکول اور بڑے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ دیکھنا، اور سونا یا سو کر اٹھنا، غرض ہر ایک کام کے لئے خاص اوقات مقرر ہیں، جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا، ظاہر ہے جب ان کی زندگی اس پابندیٔ اوقات کے ساتھ گزرے گی تو امید نہیں کہ وہ اس عبادت کو چھوڑ سکیں، اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لئے بھی فرائض اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے وہ طبیعتِ ثانیہ ہو جاتی ہے۔

(حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۷۷)

ہوسٹل کے علاوہ مختلف قسم کی سوسائٹیاں، انجمنیں اور ادارے بھی قائم کئے گئے جو طلبا کی تربیت کا کام کرتے تھے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نوجوان آٹھ دس برس وہاں گذار لیتے تھے وہ خاص خاص اخلاق وعادات اور صفات کے حامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ نماز روزہ کے پابند ہوں یا نہ ہوں[1] لیکن ان میں غیرت وحمیتِ اسلامی ہوتی تھی، جری اور بے باک ہوتے تھے، ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج ہوتے تھے، ایک دوسرے کے ہمدرد و غمگسار، ضرورت کے وقت مدد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار، تنگ نظری اور تعصب سے بالاتر، فراخ حوصلہ اور عالی ہمت ہوتے تھے۔ صاف ستھری زندگی عام بول چال میں گویا ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے۔ طبیعت میں بلند پروازی ہوتی اور شرافت وحسن اخلاق کا پیکر ہوتے تھے، میرے بچپن کی بات ہے اور خود میرے خاندان کے متعدد عزیز اور بزرگ علی گڈھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ مذکورہ بالا اوصاف اس زمانہ میں علی گڈھ کے خصوصیات میں سے سمجھے جاتے تھے۔ یہ کیرکٹر اور کردار تو تھا ان نوجوانوں کا جو علی گڈھ

---

[1] اگرچہ علی گڈھ کبھی چند ایک ایسے طلبا سے محروم نہیں رہا جو پنجوقتہ نماز تلاوتِ قرآن کے ہی پابند نہیں، تہجد کے بھی پابند ہوتے تھے۔

کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوکر آتے تھے اور خود کالج کا اسلامی کیرکٹر یہ تھا کہ یہاں ایک عالی شان مسجد ہے، اس کے علاوہ ہوسٹلوں میں بھی نماز کا اہتمام تھا. طلبا کو جماعت سے نماز ادا کرنے کی نہ صرف ترغیب دی جاتی بلکہ مسجد میں باقاعدہ حاضری بھی لی جاتی تھی مسجد میں خاص خاص دنوں میں وعظ یا درسِ قرآن کا اہتمام بھی ہوتا تھا. کالج میں تعطیل جمعہ کو ہوتی تھی پورے کیمپس میں کوئی شراب نہیں پی سکتا تھا. عورتیں بے پردہ نہیں آسکتی تھیں. کالج میں جب کوئی فنکشن ہوتا تو اس کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوتا تھا. مغرب کی نماز کے وقت جلسہ ملتوی یا ختم ہوجاتا تھا. رمضان کے دنوں میں کوئی شخص کھلے بندوں کھاتا پیتا نظر نہیں آسکتا تھا. اسلامی تیوہار اور تقریبات بڑے اہتمام اور شان وشوکت سے منائے جاتے تھے. ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت السلام علیکم کہتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی خواہ کسی عقیدہ یا خیال کا ہو لیکن کوئی شخص یونیورسٹی کے احاطہ میں خدا، پیغمبر یا مذہب کے مسلمات کے خلاف کوئی بات نہیں کہہ سکتا تھا[1]. اس ایک چیز کا اس درجہ اہتمام تھا کہ ملازمت کے وقت ہر شخص کو ایک عہدنامہ پر دستخط کرنے ہوتے تھے کہ وہ اسلام کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کہے گا اور نہ کوئی ایسا عمل کریگا جس سے اسلام کی توہین وتنقیص ہوتی ہو، علی گڈھ میں تعلیم کے ساتھ کھیل کود (Sports) پر بھی بڑا زور ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود مجال نہیں تھی کہ لڑکے اور لڑکیاں ڈرامہ میں ایک ساتھ ایکٹنگ کریں، ناچ رنگ وغیرہ یہ سب ممنوع تھے. اقبال نے جو کہا ہے :-

---

[1] اس کا اہتمام ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے زمانہ میں بھی اس درجہ تھا کہ ایک مشہور کمیونسٹ جن کا چند برس ہوئے انتقال ہوگیا ہے کا ایک مرتبہ شعبہ تاریخ میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور انھوں نے کسی لکچر میں خدا اور مذہب کے خلاف کوئی بات کہدی تو ادہر لڑکوں میں ہنگامہ ہوا ادہر ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کو فوراً نوکری سے برخواست کردیا.

آنجہ گو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

سرسید اس فلسفہ سے اچھی طرح آشنا تھے، اس لئے انھوں نے اپنے نوجوانوں کو ہمیشہ شمشیر و سناں بکف ہونے اور طاؤس و رباب سے مجتنب رہنے کی تاکید کی۔ سرسید کو ترکوں کا لباس بہت پسند تھا انھوں نے خود اسے اختیار کر لیا تھا اور چاہتے تھے کہ لڑکوں کے لئے اسے ہی یونیفارم بنا دیں۔ لیکن بقول مولانا حالی کے بعض موانع کے باعث اسے نافذ نہیں کر سکے، تاہم سرسید کے دیکھا دیکھی یہ لباس کالج میں اس درجہ مقبول ہوا کہ علی گڈھ کے تعلیم یافتہ اسے علی گڈھ سے باہر بھی استعمال کرتے تھے۔ ترکش کوٹ گیا تو اس کی جگہ شیروانی نے لی۔ کھڑے پائنچوں کا پاجامہ اور شیروانی کی ایک مخصوص تراش علی گڈھ کٹ کہلاتی تھی اور پورے ملک میں اسی نام سے معروف تھی۔ علی گڈھ میں یہ دونوں اور ان کے ساتھ ترکی ٹوپی، ان تینوں کا اس درجہ اہتمام تھا کہ کوئی استاذ یا طالب علم اپنے مکان یا کمرہ سے باہر ان کے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔ اساتذہ اور طلبا میں باہم باپ اور اولاد کا سا تعلق ہوتا تھا۔ اساتذہ کلاس روم سے باہر بھی طلبا کا برابر خیال رکھتے اور ان کی ہر قسم کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، اسی طرح طلبا ان کے ساتھ ادب و احترام اور محبت کا معاملہ کرتے تھے۔

غرض کہ یہ ہے وہ کلچر اور وہ تہذیب جس کو اس کے پورے لوازم کے ساتھ سرسید نے کالج میں برپا کیا اور یہی کلچر اس درس گاہ کی خصوصیت اور نشانِ امتیاز بن گیا۔ ۱۹۷۲ء کا ترمیمی ایکٹ منظور ہو جانے کے بعد وزیر تعلیم نے متعدد تقریروں میں بہ طور طنز کہا ہے کہ "علی گڈھ یونیورسٹی مذہبی ادارہ نہیں اور اس کا کام مولوی ملّا نے پیدا کرنا نہیں ہے"۔ گذارش یہ ہے کہ بجا فرمایا آپ نے! بیشک علی گڈھ ایک مذہبی مدرسہ نہیں اور اس نے مولوی ملاؤں کے بجائے (مولانا) محمد علی، محمد شعیب قریشی، عبدالرحمٰن بجنوری اور محفوظ علی جیسے انگریزی زبان کے ادیب اور انشا پرداز اور علوم جدیدہ کے ماہر و فاضل پیدا

ہزاروں افراد پیدا کئے ہیں جنھوں نے اس ملک کی قسمت بدل دی اور ہر شعبۂ زندگی میں ناموری حاصل کی۔ لیکن یہ سب حضرات ایک مخصوص کلچر اور تہذیب کے حامل تھے اور یہی تہذیب علی گڈھ کالج (اور پھر یونیورسٹی) کا طغرائے امتیاز تھی۔ اگر کیمبرج اور آکسفورڈ کو عیسائی تہذیب پر، بنارس ہندو یونیورسٹی کو ہندو تہذیب پر اور شانتی نکیتن کو ٹیگوری تہذیب پر فخر ہے تو بے شبہ سرسید کے کالج کو اسلامی تہذیب پر فخر تھا اور ہونا چاہیئے تھا۔

اس موقع پر گاندھی جی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں اسے برہان میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں اور موقع کی مناسبت سے اب پھر یہاں لکھتا ہوں:

۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے، ایک روز مولانا ابوالکلام آزاد نے مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ڈاکٹر ذاکر حسین (اللہ اکبر! اب یہ سب ہی مرحوم ہوگئے۔ رحمہم اللہ) مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور خاکسار راقم الحروف[ف] (کاروانِ رفتہ کے ماتم کنندگانِ حسرت سرا) ان سب کو لنچ پر مدعو کیا۔ اس دعوت کا اصل مقصد تو تھا ان مسجدوں کے متعلق مشورہ کرنا جن کے علاقوں میں ایک مسلمان بھی نہیں رہا اور اب وہ وہاں اجاڑ اور ویران پڑی ہوئی ہیں لیکن جب

ف میں عملی سیاست کا مردِ میدان کبھی بھی نہیں رہا۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد برہان کا برابر مطالعہ کرتے اور میری بعض تصانیف جو ان کی نظر سے گذر چکی تھیں ان پر تحسین فرماتے تھے خاص طور پر میری کتاب "اسلام میں غلامی کی حقیقت" کے بارہ میں فرمایا کہ اس موضوع پر مصر کے شفیق بک نے "الرق فی الاسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے اور میں نے اس کو بھی پڑھا ہے، لیکن تمہاری کتاب اس سے بھی کہیں زیادہ جامع اور بہتر ہے، بہرحال ان وجوہ سے مولانا مجھ پر خاص شفقت کی نظر رکھتے تھے اور اس لئے جب کبھی مسلمانوں سے متعلق کوئی علمی یا تعلیمی مشورہ کرنا ہوتا تھا مجھے اس میں ضرور

(اگلے صفحہ پر)

بات چلی تو اور چند امور بھی زیرِ گفتگو آگئے۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خطاب کر کے پوچھا "مولانا! کیا اب علی گڈھ اور بنارس کے ہندو مسلم یونیورسٹی نام رہ

شریک کر لیتے تھے۔ یہی ان کی وہ شفقتِ بزرگانہ تھی جس کے باعث جب مغربی بنگال کی گورنمنٹ نے ان سے کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل کی پوسٹ کے لئے آدمی طلب کیا تو انہوں نے فوراً وہاں میرا نام لکھ بھیجا، ۱۹۴۹ء میں اس عہدہ کا چارج لینے کے بعد ایک دن میں مغربی بنگال گورنمنٹ کی وزارتِ تعلیم کے اڈیشنل سکریٹری مسٹر اے۔ کے چندا سے ملا۔ یہ نہایت شگفتہ مزاج اور خوش باش بنگالی آفیسر اور مولانا آزاد کے بے تکلف دوست اور ان کے حاضر باشوں میں تھے۔ ادہر ادہر کی باتیں کرتے ہوئے اچانک چندا صاحب بولے "اور ہاں اکبرآبادی صاحب! معلوم ہوتا ہے آپ بڑے قابل آدمی ہیں!" میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ انھوں نے جواب دیا "سنیے! میں مولانا ابوالکلام کو تیس برس سے جانتا ہوں وہ کسی کی تعریف کرنے میں بیحد بخیل ہیں، لیکن آپ کی تعریف میں انھوں نے مجھ سے وہ سب کچھ کہا جو میں نے ان کی زبان سے کسی کی نسبت نہیں سنا، ہوا یہ کہ ادہر کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل کی پوسٹ کے لئے مولانا نے آپ کا نام بھیجا اور ادہر پروفیسر ہمایوں کبیر نے کلکتہ کے ہی ایک نیم بنگالی جو ڈبل ایم۔ اے تھے اور تعلیم کا پرانا تجربہ رکھتے تھے اس پوسٹ کے لئے ان کے نام کی سفارش کی۔ میں جب دہلی جاکر مولانا سے ملا اور ہمایوں کبیر کی تجویز کا ذکر کیا تو مولانا یہ سنتے ہی غصہ کے مارے سُرخ ہوگئے۔ اور فرمایا: ہرگز نہیں! اکبرآبادی کے سوا دوسرا کوئی شخص ہرگز پرنسپل نہیں ہو سکتا،" یہ کہنے کے بعد مولانا نے آپ کی نسبت وہ تعریفی الفاظ کہے جن کو میں ان کی زبان سے سن کر سخت متعجب ہو رہا تھا۔ یہ الفاظ کیا تھے؟ ان کو نہ چندا صاحب نے بیان کیا اور نہ میں نے ان کی کرید کرنا مناسب جانا! برہان میں اگر کوئی اچھا مضمون میرے قلم سے نکلتا تو عند الملاقات اس پر خوشنودی کا اظہار فرماتے تھے اور اگر کوئی جملہ یا فقرہ یا کوئی پیراگراف پسند نہیں آتا تھا

(اگلے صفحہ پر)

سگیں گے ؟ مولانا یہ سنکر جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئے اور آنکھیں بند کر کے کچھ غور فرمانے لگے اتنے میں میں نے کہا : اگر گستاخی نہ ہو تو گاندھی جی کا ایک واقعہ عرض کروں جو میں نے شفیق الرحمٰن صاحب (مرحوم) سے براہِ راست سنا ہے ، مولانا نے فرمایا کہیئے کہیئے ! بے تکلف سنایئے کیا واقعہ ہے ؟ میں نے عرض کیا : شفیق الرحمٰن صاحب نے کہا : ایک مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مالی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ اس کا چلنا دشوار ہو گیا تو اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لیے ڈاکٹر انصاری (مرحوم) کی کوٹھی نمبر ا ۔ دریا گنج میں ایک اہم اجتماع ہوا جس میں گاندھی جی ، حکیم اجمل خاں ، ڈاکٹر انصاری ، سیٹھ جمنا لال بجاج اور شفیق الرحمٰن صاحب ، قدوائی وغیرہم حضرات شریک تھے ، اصل موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک سیٹھ جمنا لال بجاج حکیم اجمل خاں صاحب کو مخاطب کر کے بولے : "حکیم صاحب ! اگر آپ جامعہ کے نام سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ لاکھوں روپیہ تو جامعہ کے لئے میں ہندوؤں سے دلوا دوں گا "، گاندھی جی اس وقت گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے ۔ یہ سنا تو اُدبدا کے پالتی مار کر بیٹھ گئے اور فرمایا : " ہیں بجاج ! یہ کیا کہا تم نے ! یہ جامعہ کا نام "اسلامیہ" تو میں نے رکھوایا ہے اور اسی مقصد اور ارادہ سے کہ یہ اسلامی کلچر کی درس گاہ ہو گی یہ کلچر دنیا کا ایک عظیم کلچر ہے اور مسلمانوں کو ہی نہیں ہندوؤں کو بھی اس کلچر کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے ۔ پھر فرمایا : آخر کوئی ایک درس گاہ تو ایسی ہونی چاہیئے جہاں اگر میں اپنے بیٹے دیو داس گاندھی کو اسلامی کلچر کی تعلیم دلانا چاہوں تو بھیج سکوں[1] ۔ اس کے بعد گاندھی جی

[1] چنانچہ غالباً دیو داس گاندھی نے کچھ عرصہ رہ کر جامعہ میں تعلیم بھی پائی ہے ۔

تو اس پر بھی متنبہ فرما دیتے اور کہتے : مولوی صاحب ! اگر آپ اس جملہ میں الفاظ کی ترتیب اس طرح کر دیتے تو کلام زیادہ بلیغ ہو جاتا ـــــ سدا رہے نام اللہ کا !

اب بھی ہیں تیرے تصور سے وہی رازو نیاز ؛ نہ بچھڑی ہوئی آغوشِ محبت کی قسم

نے حکیم صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: حکیم صاحب! آپ بجاج کی بات کا کوئی خیال نہ کریں میں اوّ آپ ملک کے دورہ پر نکلیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ہی لاکھوں روپیہ ہندوؤں سے لادوں گا۔ یہ واقعہ اس اجتماع کے سب شرکاء نے بہت دلچسپی اور توجہ سے سنا۔ جب میں سنا چکا تو مولانا نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے پوچھا: کیا یہ واقعہ صحیح ہے" ڈاکٹر صاحب نے بھی تصدیق کی اور فرمایا: جی ہاں! شفیق صاحب نے یہ واقعہ ہم لوگوں کو بھی سنایا تھا۔

سرسید انگلینڈ گئے تو وہاں علوم و فنونِ جدیدہ، نظامِ تعلیم و تربیت اور ایڈمنسٹریشن ان سب سے اس درجہ متاثر ہو کر آئے کہ یہاں بات بات میں کیمبرج اور آکسفورڈ کو سامنے رکھتے تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ یہ دونوں یونیورسٹیاں عیسائی تہذیب و تمدن اور ان کی روایات کی پاسباں ہیں اور سرسید اپنے کالج کو اسلامی تہذیب اور اس کے کلچر کا ترجمان بنانے کا عزم اور جذبہ رکھتے تھے اور اسی وجہ سے کالج کا نام "محمڈن کالج" رکھا گیا تھا۔ ورنہ اس زمانہ کے کلکتہ مدرسہ اور سنسکرت کالج کلکتہ کی طرح یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ یہ کالج صرف ایک فرقہ کے طلبا کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے فرقہ کے طلبا کے لئے اس کا دروازہ بند ہے۔ پس اگر کالج ایک جسم تھا تو اس کی روح اسلامی کلچر ہے، اگر وہ ایک پھول تھا تو اس کی بو اسلامی تہذیب تھی، اگر کالج شراب دو آتشہ کہیئے تو اسلامی ثقافت کو اس کا نشہ سمجھیئے غیرت مند اداروں اور باحمیت قومیں کس طرح اپنے کلچر اور تہذیب کی حفاظت کرتی ہیں! اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بڑی بڑی جنگیں اسی تہذیب کی خاطر ہوئی ہیں۔ اور آج بھی قوموں میں باہم کشیدگی اور رقابت کا سبب تہذیب ہی ہے۔ بہرحال سرسید اگرچہ دینیات کی تعلیم اور ان کے دروبست کا معقول اور خاطر خواہ انتظام نہیں کرسکے کیونکہ علما نے ان کے ساتھ تعاون نہیں کیا اور جو علما اس شعبہ کے ساتھ وابستہ رہے وہ درسی اور فنی استعداد کے اعتبار سے کیسے ہی لائق و فائق ہوں، فکر و نظر، مطالعہ اور

آل اندیشی کے لحاظ سے "لائے مکتب" سے زیادہ نہیں تھے لیکن اسلامی تہذیب کو قائم کرنا سرسید کے بس کی بات تھی اس میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

سات اصول :۔ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سب کو سامنے رکھیے تو سرسید نے کالج کو جن روایات کے ساتھ چھوڑا اور اس سلسلہ میں ان کی جو پالیسی رہی اسے دفعات ذیل میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) کالج صرف ایک درس گاہ نہیں تھا، بلکہ ایک تحریک تھا۔

(۲) کالج کا مقصد مسلمانوں کو حضیضِ ذلت وخواری سے نکال کر عزت ورفعت کے مقام پر لانا تھا۔

(۳) کالج میں علوم وفنونِ جدیدہ کی تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا جائے۔

(۴) کالج صرف ایک تعلیم کا نہیں بلکہ تہذیب وتربیت کا بھی مرکز تھا۔

(۵) کالج میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں اور مذاہبِ غیر کے نوجوان بھی تعلیم پاسکیں گے۔

(۶) کالج کا کوئی تعلق ملک کی سیاست سے نہیں ہوگا۔

(۷) کالج حکومتِ وقت سے اشتراک وتعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔

نواب محسن الملک کا دور : سرسید کے انتقال کے بعد سید محمود آنریری سکریٹری ہوئے، لیکن کثرتِ بادہ نوشی کے سبب ان کی صحت کو گھن لگ چکا تھا۔ وہ زیادہ دنوں نہ چل سکے اور دس ماہ کے بعد ہی یعنی ۳۱ رجنوری ۱۸۹۹ء کو نواب محسن الملک کالج کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ نواب صاحب مسلمانوں کے نہایت دردمند، خاموش کارکن اور بے حد مخلص اور مستعد بزرگ تھے۔ انھوں نے سکریٹری ہوتے ہی کالج کو وہ بال وپر دیئے کہ کالج شاہراہِ ترقی پر تیز رفتاری سے گامزن ہوگیا۔ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں :۔

سرسید کے انتقال کے بعد نہ صرف علی گڈھ کالج کی مرکزیت قائم رہی، بلکہ نواب

محسن الملک بہادر کی پالیسی سے پہلے نقصانات کی تلافی کا دور شروع ہوا..... آپ کی کوشش سے تھوڑے عرصہ میں نہ صرف کالج کے ذمہ کا پہلا قرضہ ادا کر دیا گیا، بلکہ لاکھوں روپیہ کالج میں جمع ہو گیا اور جو عمارتیں سالہا سال سے ناتمام پڑی چلی آرہی تھیں وہ مکمل ہو گئیں۔ ایک بڑا کام نواب صاحب نے یہ کیا کہ اپنے جلسوں اور قومی تقریبات میں علما اور مشائخ کو شریک کر کے جو رکاوٹ جدید اور قدیم تعلیم یافتگان میں عرصہ سے چلی آرہی تھی اسے دور کیا اور اس طرح تمام مسلمانوں کو بہت کچھ ایک مرکز پر لانے میں کامیابی حاصل کی، اس کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال کے عرصہ میں تعداد طلبا دوگنی کے قریب ہو گئی"۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۲۱)۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس: سرسید نے کالج کے نمونے پر ملک بھر میں جگہ جگہ اسلامیہ اسکول اور کالج بنانے کی غرض سے "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے ایک ادارہ کی تاسیس کی تھی۔ لیکن وہ کالج کے معاملات میں ہی اس درجہ مصروف رہے کہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے اور کانفرنس کا کام آگے نہ بڑھا۔ نواب محسن الملک نے بعد از خدمت اور روشن دماغی کی راہ سے اس ادارہ کی اہمیت اور مسلمانوں کے لیے اس کی شدید ضرورت کو محسوس کیا تو انھوں نے اس پر بھی خاطر خواہ توجہ مبذول فرمائی اور اس کو ترقی دی چنانچہ اپنے سکریٹری بننے کے پہلے ہی سال ۱۸۹۹ء کے ماہ دسمبر میں کلکتہ میں کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں ایک تجویز منظور کرائی جس کا ماحصل یہ تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ اسلامیہ کالجوں کو طلبا بہم پہونچانے کے لئے ہر ضلع یا مجموعہ اضلاع میں تمہیدی مدارس قائم کئے جائیں، اس تجویز کا اثر یہ ہوا کہ کانفرنس کی سعی اور کوشش سے مختلف مقامات میں مسلمانوں کے اسکول قائم ہونے لگے، علاوہ ازیں نواب صاحب (مرحوم) کی جدوجہد اور کوشش کے باعث ہندوستان کے بڑے بڑے صوبوں میں کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے اور ان اجلاسوں میں مقامی مسلمانوں نے اپنے اپنے

ـبوں کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق تجویزیں منظور کیں اور اس سلسلہ میں گورنمنٹ سے مطالبات کئے مثلاً مسلمان انسپکٹر اف ایجوکیشن کا تقرر، سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا بندوبست، طلبا کے لئے سرکاری وظائف، غریب طلبا کی فیس کی معافی، نصاب تعلیم میں ایسی ترمیم کہ وہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو جائے، سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی اجازت۔ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں: "یہ وہ مراعات تھیں جو ۲۰ ــ ۲۵ سال قبل گورنمنٹ نے مسلمانوں کے لئے منظور کی تھیں اور جن کی طرف اجتماعی طور پر مسلمانوں کو اس وقت توجہ ہوئی جب کہ وقت بہت کچھ نکل چکا تھا۔ بہر حال نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ جو بالآخر کانفرنس کے ذریعہ ہونا شروع ہوا۔ (ص ۲۴۲)

انگریز اساتذہ کی خدمت کا تسلسل: سرسید کو انگریز اساتذہ کی تعلیمی خدمات حاصل کرنے پر جو اصرار تھا نواب محسن الملک کو اس کی افادیت اور اہمیت کا احساس تھا اس لئے وہ اپنے دورِ سکریٹری شپ میں بھی اس پر عامل رہے۔ چنانچہ سرسید کے انتقال کے ایک برس بعد ہی جب پرنسپل بیک کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ پروفیسر مارلین پرنسپل مقرر ہوئے اور انھوں نے کالج کی ہمہ جہتی اور طلبا کی عام فلاح و بہبود کے لئے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ان سے نہ صرف یہ کہ کالج کو مزید استحکام ہوا بلکہ ملک میں بھی اس کے وقار اور شہرت کو چار چاند لگ گئے، پرنسپل مارلین طلبا سے، ان کے علی گڑھ سے فراغت کے بعد بھی تعلق اور رابطہ رکھتے، ملازمت کے حصول میں ان کی مدد کرتے اور اپنے مشوروں سے ان کی رہنمائی کرتے رہتے تھے۔

نماز کی پابندی: خود نماز روزہ کے بہت پابند تھے اور اکثر نماز باجماعت یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کرتے تھے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جب اپنے دفتر سے اٹھ کر مسجد میں نماز کیلئے جاتے تھے تو راہ میں جو مسلمان طالب علم بھی مل جاتا اسے بھی ساتھ لیتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک زمانہ میں نماز کے وقت طلبا کی باقاعدہ حاضری ہوتی تھی اور جو طلبا کسی معقول عذر کے بغیر غیر حاضر ہوتے تھے ان پر جرمانہ ہوتا تھا۔ غرض کہ سرسید نے کالج میں جو اسلامی تہذیب قائم کرنا چاہی تھی نواب محسن الملک کے زمانہ میں اس پر اور عمل ہوئی اور اس کا رنگ نکھر گیا۔